''قصہ چہار درویش'' کے منتخب تراجم میں لسانی اسلوب کا تقابلی مطالعہ

A comparative study of linguistic style in the selected translations of *Qissa Chahar Darvesh*

[i] شہزادی سدرہ [ii] ڈاکٹر راشدہ قاضی

Abstract:

The tale of the Four Darvesh occupies a prominent place in Urdu prose due to its narrative tradition and linguistic beauty. This study has made a comparative study of three important translations and compositions of this story: Bagh o Bahar by Mir Aman Dehlvi, Nao tarz e Murassa by Mir Muhammad Hussain Atta Khan Tahseen, and Nao tarz e Murassa by Muhammad Ghaus Zareen. Each writer adopted a style according to the linguistic and cultural background of his era, which reflects the developmental stages of Urdu prose. Mir Aman's Bagh o Bahar is simple, common sense and conversational in style, which was written in accordance with the goal of Fort William College, namely the promotion of understandable prose. In contrast, Tahseen's Nao Tarz e Murassa is a very complex, Persian-like and harmonious prose, which is rich in innovative craftsmanship and an abundance of similes and metaphors, which was suitable for people with classical Persian taste. Muhammad Ghaus Zareen's version presents a moderate style between the two extremes, which has both elegance and fluency. This research analyzes the choice of words, sentence structure, idioms, and rhetorical devices under modern linguistic and stylistic principles. The study clarifies how social and historical factors influenced the style and moved Urdu prose from a complex tradition to a modern simple style. This comparative study reveals the breadth and flexibility of the Urdu linguistic tradition, which can accommodate both simplicity and elegance.

Keywords: *Tale, Fiction, Urdu Literature, Linguistic Style, Translations. Fort William College, Qissa Chahar Darvesh, Mir Aman Dehlvi, Bagh o Bahar, Atta Hussain Khan Tahseen, Muhammad Ghuas Zareen, Nao Tar-z e Murassa.*

قصہ چہار درویش اردو نثر میں اپنی داستانوی روایت اور لسانی حسن کے باعث نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس تحقیق میں اس قصے کے تین اہم تراجم و تراکیب کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے: باغ و بہار از میر امن دہلوی، نو طرزِ مرصع از میر محمد حسین عطا خان تحسین، اور نو طرزِ مرصع از محمد غوث زریں۔ ہر مصنف نے اپنے عہد کے لسانی و ثقافتی پس منظر کے مطابق اسلوب اپنایا، جو اردو نثر کے ارتقائی مراحل کی عکاسی کرتا ہے۔ میر امن کا باغ و بہار سادہ، عام فہم اور مکالماتی انداز لیے ہوئے ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مقصد یعنی قابلِ فہم نثر کے فروغ کے تحت لکھا گیا۔ اس کے برعکس تحسین کا نو طرزِ مرصع نہایت پر تکلف، فارسی آمیز اور آہنگ دار نثر ہے جس میں صنعتِ بدیع اور تشبیہات و استعارات کی کثرت پائی جاتی ہے، جو کلاسیکی فارسی ذوق رکھنے والے خواص کے لیے موزوں تھی۔ محمد غوث زریں کا نسخہ دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل اسلوب پیش کرتا ہے جس میں زیبائش کے ساتھ ساتھ روانی بھی موجود ہے۔ یہ تحقیق جدید لسانیاتی و اسلوبیاتی اصولوں کے تحت الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ساخت، محاورات اور بلاغتی ہتھکنڈوں کا تجزیہ کرتی ہے۔ مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ سماجی و تاریخی عوامل نے کس طرح اسلوب کو متاثر کیا اور اردو نثر کو پر تکلف روایت سے جدید سادہ اسلوب کی جانب گامزن کیا۔ اس تقابلی جائزے سے اردو لسانی روایت کی وسعت اور لچک سامنے آتی ہے جو سادگی اور زیبائش دونوں کو اپنے اندر سمو سکتی ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو ادب، اسلوب، داستان گوئی، ترجمہ، فورٹ ولیم کالج، قصہ چہار درویش، میر امن دہلوی، باغ و بہار، عطا حسین خاں تحسین، محمد غوث زریں، نو طرزِ مرصع۔

[i] اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان۔

[ii] ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان (Corresponding Author)

داستان افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ قصہ سنانا انسانی فطرت کا حصہ ہے، اور قصہ سنانا اور سننا قدیم زمانے سے ایک فن کے طور پر رائج ہے۔ داستان نثر کی وہ طویل صنف ہے جس میں فوق الفطرت عناصر اور دیگر اجزاء کی مدد سے قصہ در قصہ یا داستان در داستان سے کہانی تک کہا جاتا ہے۔ کہی جانے والی چیز کو کہانی کہتے ہیں۔اردو کی قدیم داستانوں میں "قصہ مہر افروز و دلبر"، "بوستان خیال"، "عجائب القصص"، "فسانہ عجائب"، "نوطرزِ مرصع"، "داستانِ امیر حمزہ"، "طلسم ہوش ربا" بہت مشہور ہیں۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی داستانوں میں "باغ و بہار"، "مذہبِ عشق"، "آرائشِ محفل" وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔

"قصہ چہار درویش" اردو ادب کی ایک مشہور اور کلاسیکی داستان ہے جسے اردو نثر کے ابتدائی اور اہم نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قصے کو "باغ و بہار" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کیوں کہ میر امن دہلوی نے اسے "باغ و بہار" کے عنوان سے اردو میں تحریر کیا۔اس داستان کی اصل بنیاد فارسی میں لکھی گئی داستان "قصہ چہار درویش" ہے جسے امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔

چہار درویش کی کہانی محبت، مہم جوئی، تصوف، قربانی اور انسانی جذبوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں چار درویش مختلف حادثات اور مہمات کے بعد ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور اپنی اپنی داستان بیان کرتے ہیں۔ ہر درویش کی زندگی میں محبت اور قربانی کا ایک انوکھا پہلو موجود ہے۔اس سے پہلے اردو نثر میں فارسی الفاظ کا غلبہ تھا، لیکن میر امن نے اسے عام بول چال کی زبان میں لکھ کر اردو نثر کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔

قصے کے مرکزی کردار ایک بادشاہ عظیم آباد کا امیر حمید الدین ہے جو بیماری اور غم کی حالت میں چار درویشوں سے ملاقات کرتا ہے۔ ہر درویش اپنی زندگی کے حالات بیان کرتا ہے، اور ہر داستان میں محبت، قربانی، وفاداری اور تصوف کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ کہانی کے آخر میں سب کرداروں کے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور خوشی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔اس مقالہ میں باغ و بہار از میر امن دہلوی، نوطرز مرصع از میر محمد حسین عطا خان تحسین، نوطرز مرصع از محمد غوث زریں کے لسانی اسلوب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

میر امن کا اسلوب

میر امن دہلوی کا شمار اردو نثر کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف باغ و بہار نے اردو نثر کو ایک نئی جہت بخشی۔ ان کا اسلوب نہ صرف زبان کی شائستگی اور محاورہ بندی کا نمونہ ہے بلکہ

ہندوستانی تہذیب، سادگی، برجستگی اور برج بھاشا کے امتزاج کی زندہ مثال بھی ہے۔ میر امن کا سب سے نمایاں وصف ان کی زبان کا سادہ، سہل اور رواں ہونا ہے۔ انھوں نے فارسی طرز نثر سے انحراف کرکے اردو کو بول چال کے انداز میں استعمال کیا۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی زبان سے لطف اندوز ہو سکیں۔ جیسا کہ باغ و بہار کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے:

اب آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔[۱]

"کان دھر کر سنو" جیسا فقرہ عوامی اندازِ گفتگو کی بہترین مثال ہے۔ یہ جملہ نہ صرف کہانی کے آغاز کا اعلان کرتا ہے بلکہ سننے والے کو متوجہ کرنے کی ایک فنی چال بھی ہے۔ اس میں بیان کنندہ اپنے سامع یا قارئین کو براہِ راست مخاطب کرتا ہے اور اس سے ایک طرح کی توجہ، غور و فکر اور غیر جانب داری کی درخواست کرتا ہے۔

میر امن کے اسلوب کی ایک اور نمایاں خصوصیت محاورہ بندی ہے۔ ان کے جملے نہ صرف زبان کی روانی میں مددگار ہیں بلکہ اردو محاورات کو محفوظ کرنے کا ذریعہ بھی بنے:

جو کچھ ہو سو ہو، کہاں تلک اپنے تئیں تھانبوں؟[۲]

یہاں "کہاں تلک اپنے تئیں تھانبوں؟" ایک زندہ محاورہ ہے جو جذبات کی شدت اور بے بسی کو ادا کرتا ہے۔ یہ جملہ ایک ایسے شخص کے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے جو مدتوں تک ضبط، برداشت، اور صبر کی زندگی گزار چکا ہے، مگر اب اس کی قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے۔ "جو کچھ ہو سو ہو" ایک قسم کی بے نیازی، خود سپردگی یا تقدیر کو قبول کرنے کا اظہار ہے۔ بولنے والا سمجھ چکا ہے کہ حالات کی رو میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، اور وہ ان سب کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اگلا فقرہ "کہاں تلک اپنے تئیں تھانبوں؟" یعنی "آخر کب تک خود کو روکے رکھوں؟" اس کی اندرونی کشمکش اور بے بسی کا اظہار ہے۔

"باغ و بہار" ایک داستان ہے اور میر امن نے داستانی رنگ کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے واقعات کو تسلسل کے ساتھ، جذباتی تاثر کے تحت بیان کیا ہے۔

ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا۔[۳]

یہاں منظر کشی اور کردار کی داخلی کیفیت کو اس خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری خود کو

واقعے کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ یہ جملہ بظاہر ایک سادہ سا مشاہدہ معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں زندگی کے ایک گہرے اور تلخ سچ کو بڑی خوب صورتی سے سمیٹا گیا ہے۔ ''ایک بارگی'' یعنی اچانک، بغیر کسی پیشگی تیاری کے، جب انسان آئینے کی طرف دیکھتا ہے، تو گویا وہ خود کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ وہ چہرہ جو روز دیکھا جاتا ہے، اس دن کچھ مختلف لگتا ہے۔ ''خیال کرتے ہیں'' کا مطلب صرف دیکھنا نہیں بلکہ غور و فکر، تجزیہ اور شاید ایک لمبی سوچ کا آغاز بھی ہے۔ اور پھر ''ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا'' صرف ایک بال کا ذکر نہیں بلکہ اس کے پیچھے وقت کی بے آواز چاپ، عمر کی آمد اور جوانی کی رخصتی کی علامت ہے۔ یہ سفید بال زندگی کی حقیقتوں کا پہلا پیغام ہوتا ہے؛ جیسے قدرت آ کر کہہ رہی ہو کہ اب بچپنا اور بے فکری کا دور ختم ہوا، اب سنجیدگی، تجربے اور ذمہ داری کا وقت ہے۔

میر امن کے اسلوب میں ہندوستانی معاشرت، رسم و رواج، لباس، خوراک اور بول چال کا نمایاں عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کام صرف ادبی نہیں بلکہ ثقافتی سرمایہ بھی ہے:

> ''یہ قصہ چار درویش کا، ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاء کی طبیعت ماندی ہوئی۔[۴]

یہ اقتباس ہندوستانی صوفی روایت کی جھلک پیش کرتا ہے۔ یہ جملہ ہمیں اردو کلاسیکی ادب کی ایک دل کش روایت کی طرف لے جاتا ہے جہاں قصہ گوئی صرف تفریح نہیں بلکہ روحانی تربیت، حکمت اور محبت کی زبان تھی۔ ''یہ قصہ چار درویش کا'' کا ذکر کرتے ہوئے راوی ہمیں ایک معروف تمثیلی داستان کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کی جڑیں تصوف اور حکمت میں پیوست ہیں۔ اس کی ابتدا کے لیے امیر خسرو دہلوی کا ذکر ایک تاریخی اور روحانی گہرائی پیدا کرتا ہے، کہ یہ محض ایک کہانی نہیں بلکہ ایک ایسا قصہ ہے جو ایک عظیم شاعر اور درویش کی زبان سے نکل کر ہمارے دلوں تک پہنچا ہے۔ ''اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاء کی طبیعت ماندی ہوئی'' ایک نازک موقع کی طرف اشارہ ہے، جب ان کے پیر و مرشد کی طبیعت ناساز تھی، دل بے چین تھا، فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میر امن نے مناظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں مکمل صورت میں ابھرتے ہیں۔ اسی طرح کرداروں کے جذبات اور احساسات کو بھی دل نشین انداز میں پیش کرتے ہیں:

> جب پہر دن چڑھا، ایک بارگی پردہ اٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تختِ مبارک پر جلوس

فرمایا۔[۵]

یہ منظر ایک شاہانہ ماحول کی بھرپور منظر کشی ہے، جو کلاسیکی نثر کی خوب صورتی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ جملہ ایک شاہانہ ماحول اور درباری رسم و رواج کی بھرپور منظر نگاری پیش کرتا ہے۔ ''جب پہر دن چڑھا'' سے مراد ہے دن کے دوسرے یا تیسرے حصے میں، جب سورج چمکنے لگتا ہے اور روشنی ہر سو پھیل جاتی ہے، یہ وقت حرکت و عمل کا ہوتا ہے، دن کی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز۔ ''ایک بارگی پردہ اٹھا'' کا مطلب یہ ہے کہ اچانک، بغیر کسی تمہید کے، دربار کے سامنے موجود پردہ ہٹا دیا گیا، جیسے کسی خوابیدہ منظر میں ایک ڈرامائی موڑ آ گیا ہو۔ یہ پردہ نہ صرف جسمانی حجاب ہے بلکہ اقتدار، عظمت اور عوام و خواص کے درمیان فاصلہ کی علامت بھی ہے۔ جب یہ پردہ اٹھتا ہے تو ایک نئی حقیقت آشکار ہوتی ہے؛ بادشاہ کی موجودگی۔

اگرچہ ''باغ و بہار'' ایک سنجیدہ داستان ہے، لیکن میر امن نے بعض مقامات پر طنز و مزاح کا ہلکا سا رنگ دے کر اسلوب کو مزید دل چسپ بنایا ہے:۔

خدا اس پاس، یہ ڈھونڈے جنگل میں، ڈھنڈھورا شہر میں، لڑکا بغل میں ۔۔۔[۶]

یہ ضرب المثل طنزاً ان لوگوں پر ہے جو چیز سامنے ہونے کے باوجود دور دراز میں اس کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ جملہ مزاح، سادگی، اور عمیق حکمت کا حسین امتزاج ہے۔ بظاہر یہ ایک طنزیہ کہاوت معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے پس منظر میں انسانی فطرت اور سچائی کی ایک گہری پرت چھپی ہوئی ہے۔ ''خدا اس پاس'' یعنی جس چیز کی تلاش ہے، وہ تو انسان کے بالکل قریب ہے؛ اس کے دل میں، اس کے ضمیر میں، اس کے ارد گرد۔ مگر ''یہ ڈھونڈے جنگل میں''، انسان کی فطرت ہے کہ وہ سچ، محبت، یا خدا کو بہت دور تلاش کرتا ہے، دور دراز کی جگہوں پر، ریاضتوں، خانقاہوں، یا جنگلوں میں۔ جب کہ وہ حقیقت جسے وہ تلاش کر رہا ہے، وہ تو ہمیشہ سے اس کے قریب موجود ہوتی ہے۔

میر امن کی نثر مذہبی عقیدت سے بھرپور ہے۔ وہ جگہ جگہ اللہ، نبی کریمؐ، اور اولیاء کرام کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں اصلاح کا پہلو بھی موجود ہے:۔

درود اس کے دوست پر جس کی خاطر، زمین و آسمان کو پیدا کیا۔[۷]

یہ اقتباس ایک گہرے روحانی عقیدے اور عشقِ رسولؐ کے جذبے کا ترجمان ہے۔ یہاں ''درود''

یعنی دعائے رحمت و برکت اس ہستی پر بھیجی جا رہی ہے جو "دوست" کہلائی گئی ہے؛ یعنی سیدنا محمد مصطفیٰؐ۔ یہ اندازِ بیان خود محبت، عقیدت اور قربت سے لبریز ہے، کیوں کہ عام طور پر حضورؐ کو نبی، رسول یا حبیب کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے، مگر "دوست" کا لفظ اس تعلق کی دل آویزی اور محبت کی معراج کو ظاہر کرتا ہے۔ "جس کی خاطر زمین و آسمان کو پیدا کیا" ایک صوفیانہ تعبیر ہے، جو حدیثِ قدسی کے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد ہی آپؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ یہ جملہ نعتیہ ادب اور اسلامی تصوف میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس میں عشقِ رسولؐ کی وہ شدت نظر آتی ہے جو ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن ہے۔

میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ کا اسلوب

میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ (متوفی ۱۸۲۶ء) اردو نثر کے اولین اور ممتاز نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف نو طرزِ مرصع کو شمالی ہند کی اردو نثر کی اولین باقاعدہ ادبی تخلیق قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا اسلوب، زبان کی لطافت، بیان کی رنگینی، اور الفاظ کی تہہ داری اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ تحسینؔ کا اسلوب محض بیانیہ نہیں بلکہ شاعرانہ نثر ہے۔ ان کی تحریر میں تمثیلات، محاورات، استعارے، صنائع بدائع، اور شعر جیسی زبان ملتی ہے۔ وہ نثر کو ایسے پیرائے میں لکھتے ہیں کہ ہر سطر ایک شعری کیفیت پیدا کرتی ہے:

> صفحات گلشن افلاک چراگاہ سفیدہ کاغذ کے جلوہ نمائش کا پا کر نافہ ریز بہار عرصۂ تحریر کا نہیں ہو سکتا۔[۸]

یہ اقتباس نثر کی شاعرانہ خوبیوں کا بہترین نمونہ ہے۔ صرف واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ قاری کو جمالیاتی سطح پر محظوظ کرنا مقصد ہے۔ یہ جملہ ایک علامتی اور شعری اسلوب میں لکھا گیا ہے جس میں زبان کا جمالیاتی استعمال انتہائی باریک بینی سے کیا گیا ہے۔ "صفحات گلشنِ افلاک" سے مراد آسمان کے وہ کاغذی صفحات ہیں جو تخیل کی بلندیوں پر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کہ "چراگاہِ سفیدہ کاغذ" کا مطلب یہ ہے کہ سفید کاغذ کے میدان میں الفاظ کے چرنے کی جگہ میسر آتی ہے، یعنی لکھنے والا اس پر اپنے تخیلات اور جذبات کو آزادانہ منتقل کر سکتا ہے۔ "جلوۂ نمائش" اس بات کا اشارہ ہے کہ جب الفاظ اپنی صورت میں کاغذ پر اترتے ہیں تو وہ صرف خیالات کا اظہار نہیں ہوتے بلکہ حسن اور جمال کا نظارہ بن جاتے ہیں۔ "نافہ ریز بہار"

ایک ایسی بہار ہے جو خوشبو بکھیرتی ہے، اور یہاں اس بہار سے مراد وہ تخلیقی تحریر ہے جو قاری کے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جب تک یہ جمالیاتی عناصر نہ ہوں، صرف سفید کاغذ پر لکھ دینا تحریر کے حسن اور معنویت کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔

تحسینؔ کی نثر فارسی تراکیب سے مالامال ہے۔ ان کا اردو پر عبور واضح ہے، مگر وہ فارسی اور عربی الفاظ و محاورات کو کچھ اس انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ نثر زبانِ شعر بن جاتی ہے۔

قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا۔[۹]

یہ اقتباس مختصر مگر نہایت گہرے مفہوم کا حامل ہے، جو علامتی زبان میں انسانی حوصلے، امید اور ارادے کی عکاسی کرتا ہے۔ ''قصرِ دل'' سے مراد دل کا محل ہے، یعنی وہ جگہ جہاں جذبات، احساسات، آرزوئیں اور خواب آباد ہوتے ہیں۔ جب کوئی کہتا ہے کہ ''قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا'' تو دراصل وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگرچہ دل کو ٹھیس پہنچی ہو، یا جذبات کی دنیا ویران ہو چکی ہو، لیکن پھر بھی اسے دوبارہ تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ''قصر'' ایک ایسی پُر شکوہ علامت ہے جو انسانی دل کی وسعت، خوب صورتی اور تعمیرِ نو کی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ جملہ دراصل ایک یقین ہے کہ ٹوٹے ہوئے دل، بکھرے ہوئے احساسات، اور ماند پڑی آرزوؤں کو دوبارہ جوڑا جا سکتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ ارادہ پختہ ہو۔

تحسینؔ جیسے نثر نگار اسی لیے یادگار ہوتے ہیں کیوں کہ وہ الفاظ کے ذریعے صرف بات نہیں کرتے بلکہ قاری کی روح کو جگا دیتے ہیں، اور اسے نئی زندگی، نئی امید اور نئے خوابوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان کی عبارت اکثر متوازی تراکیب پر مشتمل ہوتی ہے:

آفتاب بھی فروغ جمال صبح اس کے سے کباب آتش حسرت کا تھا اور ماہتاب شعشۂ حسن ملیح اس کے سے داغ رشک کا بیچ سینے کے رکھتا تھا۔[۱۰]

اس اقتباس میں جمالیاتی تحیر اور شعری تمثیل کا غیر معمولی امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ تحسینؔ نے جس شخصیت یا حسن کو بیان کیا ہے، وہ اتنا تاب ناک اور دل آویز ہے کہ آفتاب جیسا درخشندہ ستارہ بھی اس کے جمالِ صبح کے سامنے حسرت کی آگ میں جلتا دکھائی دیتا ہے۔ ''فروغِ جمالِ صبح'' سے مراد وہ خوب صورتی ہے جو دن کے آغاز میں فطرت میں بکھرتی ہے، لیکن جب وہ اس شخصیت کے حسن سے ٹکراتی ہے، تو

آفتاب بھی اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے اور "کبابِ آتشِ حسرت" بن جاتا ہے، یعنی حسرت اور جلن کی شدت سے تپنے لگتا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف انداز ہے یہ کہنے کا کہ محبوب کا حسن اتنا غالب اور دل کش ہے کہ قدرت کے سب سے روشن مناظر بھی اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔

تحسین کا بیانیہ جہاں ایک طرف سنجیدہ اور ادبی ہے، وہیں دوسری طرف شوخی و بذلہ سنجی سے بھرپور ہے:

> یہ عالم طلسم کا ہے یا خواب و خیال؟ یا غلطی سے راہ گھر کی فراموش کرکے والیِ شہر کی دولت سرا پہ پہنچا ہوں؟"

یہ جملہ محض تعجب یا حیرانی نہیں، بلکہ ایک لطیف طنز بھی ہے۔ یہ اقتباس تحیر، استعجاب اور حیرت انگیزی کی ایسی دل کش کیفیت کو بیان کرتا ہے جو کسی غیر معمولی منظر یا غیر متوقع واقعے سے دوچار ہونے پر انسان کے دل و دماغ پر طاری ہو جاتی ہے۔ جملہ محض ایک ظاہری کیفیت کا بیان نہیں، بلکہ داخلی جذبات اور نفسیاتی کشمکش کا عکس ہے۔ "یہ عالم طلسم کا ہے یا خواب و خیال؟" اس سوالیہ انداز میں نہ صرف حیرت چھپی ہوئی ہے بلکہ ایک جادوئی کیفیت کا اظہار بھی ہے۔

تحسین کی نثر میں فطرت، شہروں، محلّات اور فضا کی جو منظر کشی ہے وہ اردو نثر میں مثالی ہے:

> ہر صفحہ اس صحیفۂ فیض کا برائے خود ایک گلشن ہے کہ ہر طرف تختہ تختہ بہار خط و خال شاہدان زرّیں لباس کی بیچ اس کے رونق افزائے دیدۂ نظارگیوں کے ہو رہی ہے۔[۱۲]

یہ اقتباس ادبی نثر کی ایک بے مثال نظیر ہے، جو تصویری بیانیہ، شاعرانہ فضا اور معنوی گہرائی سے لبریز ہے۔ اس میں مصنف نے ایک صحیفے، یعنی کسی مقدس یا قیمتی کتاب کو نہایت دل کش استعاروں میں پیش کیا ہے۔ جملے کا آغاز "ہر صفحہ اس صحیفۂ فیض کا برائے خود ایک گلشن ہے" سے ہوتا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ کتاب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر صفحہ ایک الگ بہار آفرین باغ ہے۔ یہاں "صحیفۂ فیض" کا مطلب ہے ایک ایسی کتاب جو فیض، برکت اور روحانی علم سے بھری ہوئی ہو، اور اس کا ہر صفحہ کسی جادوئی گلزار کی مانند نظر آتا ہے، جہاں لفظ لفظ میں زندگی، حسن، اور روشنی سانس لے رہی ہو۔ "برائے خود ایک گلشن" کہنا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ کتاب کا ہر صفحہ اپنی انفرادیت میں مکمل ہے، اور کسی دوسرے صفحے کا محتاج نہیں۔

غوث زریں کا اسلوب

"نو طرزِ مرصع" کے تناظر میں جب ہم غوث زریں کے اسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی نثر میں فکری گہرائی، تاریخی شعور، اور زبان کی سادگی و شائستگی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ غوث زریں کا نثری اسلوب اردو نثر کی کلاسیکی روایت میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان کا اسلوب جذباتی تاثر، شعریت، اور قصہ گوئی کی خوب صورتی کا حسین امتزاج ہے۔ غوث زریں کی نثر میں تشبیہات، استعارات اور دیگر بلاغی صنعتیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر ایسا ہے کہ قاری تخیل کے ایک حسین جہان میں داخل ہو جاتا ہے۔ مثلاً، ایک منظر میں وہ نازنین کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> دیکھا تو ایک نازنین چودہ سالہ، آتش کا پرکالہ کہ آفتاب اُس سے شرمندہ اور مہتاب اُس کا بندہ؛ زخمی صندوق میں تڑپتی ہے۔[۱۳]

یہ اقتباس ان کی فنی مہارت، مبالغہ آمیز حسن نگاری اور جذباتی شدت کا نمونہ ہے۔ یہ اقتباس ایک نہایت دل کش، جذبات انگیز اور پُراثر فقرہ ہے جو زبان و بیان کے حسن اور تخیّل کی بلندی کی مثال ہے۔ اس میں ایک چودہ سالہ خوب صورت لڑکی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو بظاہر ایک "زخمی صندوق" میں تڑپ رہی ہے، لیکن اس کی خوب صورتی اور معصومیت اتنی شدید ہے کہ کائنات کی سب سے روشن چیزیں، یعنی آفتاب (سورج) اور مہتاب (چاند)، اس کے سامنے ہیچ محسوس ہوتی ہیں۔ "دیکھا تو ایک نازنین چودہ سالہ" کا مطلب ہے کہ بیان کنندہ کی نگاہ ایک نہایت حسین اور کمسن لڑکی پر پڑی، جو ابھی عمر کے آغاز میں ہے مگر حسن کے عروج پر۔ "آتش کا پرکالہ" اس کے جوش، تپش اور زندگی سے بھرپور ہونے کی علامت ہے، جیسے وہ لڑکی کوئی بھڑکتا ہوا شعلہ ہو۔ اس تشبیہ سے اس کے وجود میں پوشیدہ طاقت، جذبات اور حرارت کا اظہار ہوتا ہے۔ "کہ آفتاب اُس سے شرمندہ اور مہتاب اُس کا بندہ" ایک مبالغہ آرائی پر مبنی مگر پُراثر فقرہ ہے، جو بتاتا ہے کہ اس کی خوب صورتی اتنی درخشاں ہے کہ سورج کو شرمندگی ہوتی ہے اور چاند تو گویا اس کا غلام بن چکا ہے؛ یہ بیان قاری کو لڑکی کے جمالیاتی کمال سے روشناس کراتا ہے۔

غوث زریں کے اسلوب میں قصہ گوئی کی قدیم روایت کو خوب صورتی سے نبھایا گیا ہے۔ ہر کردار کی داستان اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ قاری پوری توجہ سے سنتا یا پڑھتا ہے:

> پوشیدہ کھڑا ہوا تا دریافت کرے، انسان ہیں یا شیطان، ناگاہ، ایک فقیر بولا کہ: ہم تم ہر

ایک نے بہت سارج اُٹھایا اور آج آب و دانہ یہاں لایا۔[۱۴]

یہ اقتباس داستان گوئی، جملوں کی روانی اور تجسّس پیدا کرنے کی خوب صورت مثال ہے۔ یہ اقتباس ایک گہرے معنوی پس منظر کا حامل ہے، جو انسان کے باطن، اس کے اعمال اور قسمت کے راز کو فصاحت و بلاغت سے آشکار کرتا ہے۔ ''پوشیدہ کھڑا ہوا تادریافت کرے'' سے مراد ہے کہ ایک کردار چھپ کر یا چپکے سے اس ارادے سے کھڑا ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت کا پتا چلائے کہ سامنے والے کون ہیں، ''انسان ہیں یا شیطان''۔ یہ سوال اپنے اندر ایک تہہ دار معنویت رکھتا ہے۔ اس میں انسان کے اخلاقی وجود پر سوال اٹھایا گیا ہے کہ وہ بظاہر انسان ہونے کے باوجود اپنے رویے، افعال یا کردار میں شیطان سے بھی بڑھ کر ہو سکتا ہے۔ یہ فقرہ ایک داخلی کشمکش اور سماجی رویوں پر طنز ہے، جہاں انسانوں کے چہرے پر انسانیت کا نقاب ہے لیکن ان کے افعال غیر انسانی اور سنگ دل ہو چکے ہیں۔

غوث زریں کی نثر میں جذبات کی شدت اور منظر کی جزئیات کو نہایت مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ قاری نہ صرف الفاظ پڑھتا ہے بلکہ منظر کو محسوس کرتا ہے:

جو دیکھا پڑا وہ جواں سرنگوں
بہا میری آنکھوں سے دریائے خوں[۱۵]

یہ جذباتی شدت داستان کو محض تفریح سے بڑھا کر ایک روحانی و جذباتی تجربہ بنا دیتی ہے۔ یہ اشعار جذباتی شدت، الم انگیزی اور انسانی درد کی نہایت موثر اور پراثر ترجمانی کرتے ہیں۔ پہلے مصرعے ''جو دیکھا پڑا وہ جواں سرنگوں'' میں شاعر ایک نوجوان کو زمین پر گرا ہوا دیکھتا ہے، جس کا سر جھکا ہوا ہے، یا تو وہ زندگی کی جنگ ہار چکا ہے یا ظلم و جبر کا شکار ہو چکا ہے۔ ''سرنگوں'' ہونا ایک علامتی کیفیت ہے جو شکست، مظلومیت یا موت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یہاں ''جواں'' کا لفظ خاص طور پر اہم ہے، کیوں کہ یہ نوجوانی یعنی زندگی کی بھرپور توانائی، امید اور امکان کی علامت ہے۔ مگر وہ جواں اب بے بس اور گرا ہوا ہے، جو شاعر کے دل میں ایک گہرا صدمہ اور غم پیدا کرتا ہے۔

غوث زریں کے اسلوب میں صوفیانہ فکر اور اخلاقی پیغام بھی جھلکتا ہے۔ ان کی تحریر محض قصہ گوئی نہیں بلکہ اصلاحِ باطن کا بھی ذریعہ بنتی ہے:

یہ لازم ہے جو آدمی پیر ہو
اُسے زادِ عقبیٰ کی تدبیر ہو
میرے حق میں اکسیر ہے بندگی
کہ بے بندگی، ہیچ ہے زندگی[۱۶]

یہ اشعار اخلاقی اور روحانی بصیرت سے لبریز ہیں، جو انسان کی زندگی کے حقیقی مقصد، بندگی کی اہمیت، اور آخرت کی تیاری پر زور دیتے ہیں۔ پہلے مصرعے "یہ لازم ہے جو آدمی پیر ہو" میں "پیر" سے مراد ہے کوئی بزرگ، رہنما، یا عمر و تجربے میں فائق انسان۔ شاعر یہاں ایک اصولی بات بیان کر رہا ہے کہ اگر کوئی شخص عمر رسیدہ ہے، یا وہ دوسروں کا رہنما یا پیشوا ہے، تو اس پر کچھ خاص ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔

غوث زریں کے اسلوب میں سجع یعنی ہم آہنگ جملے خصوصاً نمایاں ہیں۔ ان کی نثر میں الفاظ کے چناؤ اور جملوں کی ترتیب اس انداز سے ہوتی ہے کہ وہ نثر کو شاعری کی طرح نغمگی عطا کرتی ہے:

> پوشیدہ نہ رہے کہ سوائے تذکرہ الٰہی، سب گفتگو واہی ہے، مگر حکایات عشق انگیز اور روایات درد آمیز، نور سیدگانِ عالمِ امکاں کو نیرنگی روزگار سے گوش گزار اور صانع بدائع قادر بر حق سے خبردار کرتی ہیں۔[۱۷]

یہاں "عشق انگیز"، "درد آمیز"، "نیرنگی روزگار"، "صانع بدائع" جیسے الفاظ کی ہم آہنگی اور نظم و نثر کی درمیانی کیفیت اُن کے فنی ذوق کی دلیل ہے۔ یہ اقتباس فصاحت و بلاغت سے بھرپور ایک اعلیٰ درجے کی نثر کا نمونہ ہے، جس میں صوفیانہ فکر، اخلاقی تعلیم، اور ادبی حُسن کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں دنیاوی گفتگو، عشق کی حکایات، اور خدا کی صناعی جیسے بڑے موضوعات کو نہایت مہذب اور ادبی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

غوث زریں کی نثر میں فطرت نگاری اس درجہ عمدہ ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود منظر کا مشاہدہ کر رہا ہے:

> زمیں سبز تھی اور ہوا خوش گوار، درختوں یہ قدرتِ خدا کی، بہار نمایاں، سراسر وہ سبزے کی موج۔[۱۸]

یہ اقتباس دکھاتا ہے کہ وہ صرف قصہ گو نہیں بلکہ فطرت کے مصور بھی ہیں، جن کی نثر میں

نظارگی کا پہلو غالب ہے۔ یہ جملہ قدرتی حسن کی ایک دل کش، تخیلاتی اور روح پرور منظر کشی ہے جو فطرت کی دل نوازی، رنگینی اور خالق کی صناعی کو نہایت سادہ مگر موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ ہر فقرہ ایک الگ زاویے سے کائنات کے حسن کی جھلک دکھاتا ہے، اور مل کر ایک ایسا مکمل منظر بناتے ہیں جو قاری کو گویا خود اس فضا میں لا کھڑا کرتا ہے۔

غوث زریں کی نثر میں مکالمہ نگاری ایک اہم عنصر ہے، جو کرداروں کو جاندار بناتا ہے اور قاری کی توجہ قائم رکھتا ہے:

> کہا: اے یار دل نواز! تو بھی اپنا ساز منگا اور کچھ گا۔ اُس نے ساز منگایا، اس خیال سے ترانہ گایا کہ پانی چلنے سے اور پرند اڑنے سے رہا۔[۱۹]

یہ مکالمات کردار کی نفسیات، فضا کی کیفیت اور رومانویت کو بیک وقت پیش کرتے ہیں۔ یہ اقتباس ایک لطیف، جذباتی اور نیم رُوحانی کیفیت کا حامل ہے، جس میں دو دوستوں یا ہم نشینوں کے درمیان ایک حسین لمحے، موسیقی اور فطرت کی ہم آہنگی کو نہایت پُراثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر جملہ کسی نہ کسی داخلی یا خارجی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے، کہیں محبت کی مٹھاس ہے، کہیں فن کی لطافت، اور کہیں فطرت سے جُڑی ایک وجدانی ہم آہنگی۔

غوث زریں کی تحریر میں وحدتِ اسلوب پایا جاتا ہے، یعنی زبان، فضا، اندازِ بیان، کردار سب ایک ہی ذوق اور لحن میں ترتیب دیے گئے ہیں، جو قصے کو مربوط اور دل نشین بناتا ہے۔ مثال کے طور پر:

> کہا: میرا تخت بے جانشین اور انگشتری بے نگیں ہے۔ خدا نے مجھے ملک کا مالک کیا، مگر فرزند نہ دیا۔ اب دنیا سے نفرت اور فکرِ آخرت ہے۔[۲۰]

یہ اسلوب داستانی فضا، جذبات، اور فلسفیانہ فکر کا حسین امتزاج ہے۔ یہ اقتباس ایک بادشاہ یا حکمران کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی سچی اور درد بھری فریاد ہے، جو ظاہر تو ایک طاقتور انسان ہے لیکن باطن میں تنہائی، ادھورے پن اور مایوسی کا شکار ہے۔ یہ کلام نہ صرف ایک ذاتی دکھ کی کہانی سناتا ہے بلکہ انسانی فطرت، اقتدار کی ناپائیداری، اور آخرت کی یاددہانی جیسے گہرے موضوعات کو بھی چھو جاتا ہے۔

غوث زریں کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ہی واقعے کو کئی زاویوں سے بیان کرتے ہیں۔ وہ تفصیلات میں ڈوب کر ایک ہی منظر کو بار بار نئے پیرائے میں بیان کرتے ہیں، مثلاً:

جو میں دیکھا اُس نازنیں کا جمال
ہوئی زلف اُس کی محبت کا جال
اُسے دیکھ گھائل، مرا دل ہوا
یہ تڑپا، یہ تڑپا کہ بسمل ہوا[۲۱]

یہ اشعار ایک ہی لمحۂ جمالی کو جذباتی شدت، منظر نگاری اور شعری اظہار کے ذریعے کئی پرتوں میں بیان کرتے ہیں۔ یہ اشعار ایک عاشق کے دل کی انتہائی پُراثر اور سچی کیفیت کو بیان کرتے ہیں، جہاں حسن کی ایک جھلک دل کو زخمی کر دیتی ہے، اور عشق کی گرفت ایسی سخت ہوتی ہے کہ عاشق گویا شکار کی مانند تڑپنے لگتا ہے۔ ان اشعار میں تغزل، حسنِ بیان، اور جذباتی شدت کا حسین امتزاج ہے، جو قاری کو عشق کی گہرائی اور اس کے درد کا براہِ راست تجربہ عطا کرتا ہے۔

ان تینوں مصنفین کے اسالیب کا تقابل ہمیں بتاتا ہے کہ ایک ہی داستان کو مختلف زبان و بیان سے کس طرح نیا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ باغ و بہار کا پلاٹ نہایت مربوط، سیدھا اور قصہ گوئی کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اس میں چار درویشوں کے قصے ایک فریم اسٹوری کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں۔ میر امن نے اسے نہایت سلیقے سے ترتیب دیا۔ نوطرز مرصع (تحسین) کا پلاٹ کہیں زیادہ مرصع اور تفصیلی ہے۔ واقعات کی کثرت اور جزئیات نگاری اس کا خاصہ ہے۔ تحسین نے بعض مقامات پر مبالغہ اور طوالت سے بھی کام لیا، جو ان کے اسلوب کا حصہ ہے۔ غوث زریں کے ہاں پلاٹ میں بعض کمزوریاں اور سادگی پائی جاتی ہیں، مگر ان کا انفرادی ذوق نمایاں رہتا ہے۔ ان کے بیانیے میں اخلاقی رنگ اور صوفیانہ حکایات کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ میر امن کے کردار زندگی سے قریب ہیں۔ وزیر، بادشاہ، درویش اور پری جیسے کردار سادہ مگر مؤثر ہیں۔ پری کا کردار خاص طور پر قابل ذکر ہے جو تخیل اور حقیقت کا حسین امتزاج ہے۔ تحسین کے کردار زیادہ رومانوی اور تقدیر و عشق کے زیرِ اثر ہیں۔ ان کے ہاں روحانی جستجو اور عشق کا عنصر غالب ہے۔ مکالمے زیادہ آرائشی اور فلسفیانہ ہوتے ہیں۔ غوث زریں کے کردار صوفیانہ اور اخلاقی اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی پیغام دینا بھی ہے۔

ادب کا اسلوب کسی بھی عہد کے فکری، تہذیبی اور سماجی رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔ اردو نثر و نظم کے ارتقائی سفر میں اسلوب کی تبدیلیاں محض لسانی یا فنی نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی عوامل کے زیرِ اثر واقع

ہوئیں۔ اسلوب سے مراد محض زبان و بیان کا طریقہ نہیں بلکہ اس میں مصنف یا شاعر کا زاویۂ نظر، اس کے خیالات کو پیش کرنے کا طریقہ، اس کی فنی مہارت، اور قاری کے ساتھ اس کا تعلق سب شامل ہیں۔ جب ہم اردو ادب میں ادبی اسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مختلف ادوار کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ہر عہد میں معاشرت، سیاست، مذہب اور علم و فن کے حالات اسلوب پر براہِ راست اثر انداز ہوئے۔ ادبی اسلوب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کلاسیکی اردو نثر میں سادگی کم اور تکلف زیادہ ملتا ہے۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی تحریروں میں زبان کا ایک خاص وقار اور تفصیل پسندی پائی جاتی ہے۔ میر امن کی باغ و بہار اسلوب کی سادگی اور شگفتگی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں ایسے الفاظ اور تراکیب استعمال کی گئی ہیں جو عام فہم اور دل نشین ہیں۔ دوسری طرف میر محمد حسین تحسین کی نو طرز مرصع اور غوث زریں کی تحریروں میں کہیں کہیں فارسی زدہ اور فنی رنگ نمایاں ہے جو اپنے عہد کے ذوقِ ادب کا پتا دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ میر امن، باغ و بہار (آگرہ: الیکٹرک ابوالعلائی پریس انڈیا، س ن)، ۵۔
۲۔ ایضاً، ۵۸۔
۳۔ ایضاً، ۶۔
۴۔ ایضاً، ۳۔
۵۔ ایضاً، ۹۔
۶۔ ایضاً، ۸۔
۷۔ ایضاً، ۲۔
۸۔ میر محمد حسین عطا خان تحسین، نو طرز مرصع (دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، س ن)، ۱۴۔
۹۔ ایضاً، ۲۵۔
۱۰۔ ایضاً، ۳۶۔
۱۱۔ ایضاً، ۵۳۔
۱۲۔ ایضاً، ۱۸۔
۱۳۔ غوث زریں، نو طرز مرصع (دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، س ن)، ۱۲۔
۱۴۔ ایضاً، ۱۱۔
۱۵۔ ایضاً، ۱۱۔
۱۶۔ ایضاً، ۱۲۔
۱۷۔ ایضاً، ۱۵۔
۱۸۔ ایضاً، ۲۲۔
۱۹۔ ایضاً، ۲۱۔
۲۰۔ ایضاً، ۲۸۔
۲۱۔ ایضاً، ۲۳۔